مجھے آنسو دے دو

(احمد حسین مجاہد کی کتاب صفحۂ خاک کے بارے میں ایک تاثر)

(عائشہ الیاس)

اپنے بستر کے ایک کونے پہ کتاب اُلٹی ۔۔۔بھیگے دوپٹے سے گردن خشک کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہُوئے میں اُٹھی ۔۔۔منہ پہ پانی کے چند چھینٹے مارے اور ذہن میں چیختے، چنگھاڑتے لفظوں پہ خاموشی کی اک پُراسرار مُہر ثبت کرتے ہُوئے میں نے فریم میں لگے جامنی دامن کو اُٹھایا جس پر آج صبح ہی سبز ہائی لائیٹر سے بیل بنائی تھی اور جس کے اک سرے پر آسمانی رنگ کے ستارے جھلملا رہے تھے ۔۔۔ساکت ہونٹوں، جامد سوچ کے ساتھ ۔۔۔کانپتی پوروں سے چند ستارے اُٹھا کر اُس دامن پر رکھے مگر کاڑھنے کی ہمت نہ ہُوئی ۔۔۔ایک سرد آہ کے ساتھ اُسے وہیں رکھا جہاں سے اُٹھایا تھا ۔۔۔غمزدہ دامن پر اُمیدوں کے ستارے ٹانکنا کسے آسان لگتا ہے ۔۔۔؟

سو دوبارہ اُسی کو اُٹھالیا ۔۔۔وُہ جس کے ورق ورق پر زندگی نوحہ خواں تھی ۔۔۔! ابھی جیسے میری آنکھوں کے سامنے ہی اُس ان دیکھے شخص کی لاش اِک ٹوٹے دروازے پہ ڈالی گئی تھی کہ جس کی تصویر بھی میں نے اُس کی موت کے ایک سال اور دس مہینے بعد دیکھی تھی کہ میرے کانوں میں حقیقت نے "کھانا کھالو" کی آواز لگائی ۔۔۔میں اِس "صفحۂ خاک" کے ۲۷ ورق اُلٹ چکی تھی ۔روح تک اُس زہریلی گولی کی کڑواہٹ تھی جسے میں پچھلے ایک گھنٹہ سے چاٹ رہی تھی، ایسے میں نوالہ کس کافر کے حلق سے اُترتا تھا ۔۔۔سو کھانا چھوڑ کے واپس آگئی ۔۔۔کل جب یہ کتاب ملی تھی تو کھولتے ہی جن لفظوں پہ نظر پڑی، انہوں نے آگے پڑھنے کی تمام تر قوتیں چھین لیں ۔۔۔

ے ملبے سے نکالے تھے کئی پھول، کئی خواب

اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا

مگر ایک دوست کی ضد تھی کہ جلد ہی پڑھو ۔۔۔سو آج اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے اِسے کھولا تھا ۔۔۔

چند لمحے سرورق پر بکھری عمارتوں کے ملبے کو دیکھا ۔۔۔پناہ گاہیں جو قتل گاہیں بن گئی تھیں ۔۔۔۔ملبے پہ سر پکڑ کے بیٹھے بابے کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔

اگست ۲۰۰۴ میں ناران جانے کا اتفاق ہُوا تھا، تب بالاکوٹ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی مگر آٹھ اکتوبر کے بعد لگا تھا میں اس کے ایک ایک گلی کوچے، ایک ایک مکین سے واقف ہُوں، جیسے یہ اُجڑے دیار کبھی میرا مسکن تھے ۔۔۔آج جب یہ کتاب کھولی تو لگا ۔۔۔اندھیرے کمرے میں اپنے بستر پر چت لیٹی ۔۔۔کسی غیر مرئی نکتے پہ نظریں جمائے میں اپنی یادوں سے کھرنڈ کھرچ رہی ہُوں ۔۔۔

"کبھی ہم خوبصورت تھے ۔۔۔" نجانے کب پہلی بار یہ نظم سنی تھی ۔۔۔پسند تو پہلے سے تھی ۔۔۔مگر آٹھ اکتوبر کے بعد جب جب ٹی۔وی پہ آئی، ہم اِس کے بولوں کو آنسوؤں سے پروتے جاتے ۔۔۔

باڑہ گلی ہمیں ہمیشہ سے بہت پسند ہے مگر ۲۰۰۶ کی گرمیوں میں باڑہ گلی کے نام سے بھی اُلجھن ہونے لگی تھی۔۔۔کہیں اندر ہی اندر ''مت جاؤ'' کی گردان ہو رہی تھی۔ یہ خوف تھا یا کچھ اور، نہیں معلوم مگر یہ حقیقت ہے کہ اگست ۲۰۰۶ کی شاموں میں میں نے باڑہ گلی کی رونقوں میں جس ویرانی کو محسوس کیا وہ بیان سے باہر ہے۔۔۔وہاں میں نے کتنی بار پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوتے سورج کی شکستگی کا نظارہ کیا۔۔۔جس کے ماتھے پہ رنج والم کی داستانیں تھیں اور جس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو۔۔۔بارہ اگست ۲۰۰۷ کو جب ہم باڑہ گلی سے نتھیا گلی تک TRACK سے جا رہے تھے تو میں اپنے ہنستے کھلکھلاتے خاندان سے کوئی دس قدم آگے۔۔۔''کبھی ہم خوبصورت تھے۔۔۔'' گنگناتے ہوئے چل رہی تھی۔۔۔موسم بے انتہا خوبصورت تھا، پہاڑوں کے سروں سے بادل اٹھکیلیاں کرتے اور دھیمے دھیمے چلتی ہوا پتوں کو ہلا کر مسکراتی۔۔۔مگر میرا تخیل مجھے کچھ پیچھے لے گیا، جہاں میں نے پہاڑوں کو بکھرتے دیکھا۔۔۔میں نے دیکھا۔۔۔جھیل سیف الملوک میں پتھر لڑھک لڑھک کے گر رہے ہیں۔۔۔میں نے دیکھا میں ایک اُجڑے گاؤں کے باہر زمین پر بیٹھی ہوں۔۔۔میرا تخیل مجھے روتے، اپنے بال نوچتے ہوئے دکھا رہا تھا۔۔۔میں نے سر کو جھٹکا اور پیچھے ہو لی۔۔۔جہاں صرف مسکراہٹیں تھیں۔۔۔میں اُٹھی۔۔۔میرے چہرے پہ آنسو سوکھ چکے تھے۔۔۔جو کہیں کہیں پسینے میں مل کر میرے رخساروں سے چپک رہے تھے۔۔۔میں نے تکیے کو چھوا۔۔۔وہ بھیگ چکا تھا، اُسے اُلٹ کر رکھا اور سائیڈ ٹیبل سے اپنی ڈائری اُٹھائی۔۔۔میں نے پانچ جنوری ۲۰۰۶ کو ایک نظم لکھی تھی۔۔۔شاید نظم یہ تھی۔۔۔

مجھے دے دو۔۔۔!

کوئی آنسو جو پل دو پل

مری پلکوں پہ لرزے اور پھر مٹی میں مل جائے

اُسی مٹی میں

جس میں خواب دفنائے گئے تھے

خواب جن کو اب کوئی روتا نہیں ہے

مجھ کو آنسو دو۔۔۔!

میں اُن خوابوں کو رو لوں

مجھ کو آنسو دو۔۔۔!

میں رو لوں اُن امیدوں کو

جو مرتے دم لگائی تھیں کسی نے اپنے سینے سے

میں اُن پھولوں کو رو لوں

جو ابھی کھلنے نہ پائے تھے

میں رو لوں اُن دنوں کو

جو کسی نے ہنس کے کاٹے تھے

میں رو لوں اُن ہواؤں کو

جو نوحے میں بدل کر رہ گئی تھیں

اُن دعاؤں کو

جو مرجھائے ہوئے ہونٹوں پہ جم کر رہ گئی تھیں

اُن کتابوں کو

کہ جن کو موت کی دیمک نے چاٹا تھا

میں رونا چاہتی ہُوں

خوب رونا چاہتی ہُوں

اُن دکھوں کو

اُن غموں کو

جو زمیں کی ایک جنبش نے

مرے دامن میں بھر کر

مجھ کو ویراں کر دیا ہے

کتابیں ختم ہو جاتی ہیں ---کہانیاں زندہ رہتی ہیں---میں نہیں جانتی میں نے جو لکھا ادب کی زبان میں اِسے کیا کہتے ہیں---تبصرہ---نہیں، یہ تبصرہ تو نہیں---دکھوں پہ تبصرے تو نہیں کئے جاتے---ان پر تو صرف ماتم کیا جاتا ہے---میں نے دیکھا---میں بے خیالی میں اپنے دامن پہ لگے ستارے نوچ رہی تھی---کیوں---میں نہیں جانتی---